شمس الرحمن فاروقی (الہ آباد)

تبصـــرہ نگاری کا فن

فی زمانہ تبصرہ نگاری کے نام پر بڑے حیرت انگیز شذرات سامنے آ رہے ہیں۔ ہمارے رسائل اور روزنامہ جات کے تبصرہ نگاران اپنی "بقراطی" میں کتاب کے مصنف کو یکسر نا قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ پورے تبصرہ میں آپ کو محسوس ہوگا کہ کتاب کا مصنف بے چارہ گنہگار کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہے اور فاضل تبصرہ نگار "جج صاحب" کی طرح فیصلہ سنا رہے ہیں۔ کچھ ایسا ہی محاکاتی منظر نامہ تبصرہ سے سامنے آنے لگا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے فاضل تبصرہ نگار کی کوئی ایک بھی کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی ہوتی ہے (کہ وہ اشاعت کی صعوبتوں کو براہِ راست جان سکے) لیکن اس کے باوجود "ایسے لکھتے تو بہتر تھا، یہ نہ ہوتا تو کتاب واقعی کتاب ہوتی" وغیرہ فقرے تبصرہ کی جان ہوتے ہیں۔ گزشتہ دنوں میری کتاب "مکتوباتِ یگانہ" پر ایک 'روزنامیاتی' صاحب نے تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا کہ 'کتاب میں 'نام لیوا' کی ترکیب غلط صرف پر بروئے کار لائی گئی ہے اور یگانہ دیکھتے تو کیسا محسوس کرتے' فاضل تبصرہ نگار نے 'نام لیوا' کے معنی 'اولاد' بتائے تھے۔ اور میں نے اپنی کتاب میں اسے 'نام لینے والا' کے محل پر استعمال کیا تھا۔ میں ایسی بیوقوفانہ بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا تھا بلکہ آج بھی نہیں سمجھتا ہوں لیکن تبصرہ نگاری کا ذکر چھڑا ہے تو عرض کیے دیتا ہوں۔ دو اسناد ملاحظہ کریں۔

☆☆ نام لیوا۔ نام لینے والا، یاد کرنے والا

نام لیوا الفتِ اصنام کے
جینے والے ہیں اسی کے نام کے (جلال لکھنوی)

(نور اللغات جلد چہارم، مطبوعہ اشاعت العلوم پریس، فرنگی محل، لکھنو، جنوری 1931 صفحہ نمبر 782)

☆☆ نام لیوا۔ ماننے والا، معتقد، ارادت مند ہونا

اور اے قاتل زمانے میں کہاں تیرا جواب
ترک گردوں نام لیوا ہے تری تلوار کا (داغ دہلوی)

(محاوراتِ داغ دہلوی، مولفہ ولی احمد خان، مطبوعہ مکتبہ ادب اردو بازار دہلی، اپریل 1944 صفحہ نمبر 350 شعر ماخوذ از ضمیمہ یادگارِ داغ)

وسیم فرحت کارنجوی

تبصرے کے بارے میں چھان بین کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ اخلاقی، مکتبی، علمی، اخلاقی پہلو سے بات کی جائے تو اس طرح کے سوال اٹھائے جائیں گے۔ تبصرے میں غیر جانب داری کا کیا مقام ہے؟ مبصر کے لئے کتاب سے کس حد تک واقف ہونا ضروری ہے؟ تبصرہ نگار کو کتاب کے نقائص کی نشان دہی اور اس

کے محاسن کی تعریف میں کیا تناسب رکھنا چاہئے وغیرہ نکتی چھان بین میں کچھ اس طرح کے سوالوں سے بات شروع ہوگی۔ تبصرہ فن ہے یا مشق یعنی Art ہے یا Skill دوسرے الفاظ میں، کیا تبصرہ نگار بھی شاعر کی طرح تلمیذالرحمن ہوتا ہے یا مشق و مزاولت کے بل بوتے پر ہر شخص تبصرہ نگار بن سکتا ہے؟ تبصرہ کتنا طویل ہونا چاہیئے؟ تبصرہ نگاری اور تاثرات نگاری میں کیا فرق ہے؟ کیا تبصرے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی اس فن کو برتتا ہو جس کا اظہار کتاب میں کیا گیا ہے؟ یعنی کیا شعری مجموعے کے مبصر کا شاعر ہونا ضروری ہے؟ علمی نقطۂ نظر سے گفتگو میں صرف ایک ہی سوال ہوگا یعنی کہ تبصرہ اور تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہے؟

میں اس مختصر سے مضمون میں تبصرہ نگاری کی تاریخ اور اردو کے اچھے یا مشہور تبصرہ نگاروں کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔ حالی سے لے کر آل احمد سرور، محمد حسن عسکری سے لے کر محمود ایاز تک اردو میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی ہے جنہوں نے بہت اچھے تبصرے لکھے ہیں۔ ان مسائل پر معلومات حاصل کرنے کے اور بھی ذرائع ہیں۔ میں تبصرہ نگاری کے صرف اخلاقی اور علمی مسائل پر کچھ ضروری اشارے کروں گا۔

اخلاقی مسائل کو میں نے اس لئے اہمیت دی ہے کہ یہی مسائل تبصرے کے قاری، کتاب اور مبصر سے براہ راست متعلق ہیں اور یہ رشتہ نہ صرف براہ راست ہے بلکہ بہت گہرا اور اصلی بھی ہے۔ بحیثیت ایک قاری میری دلچسپی صرف یہ ہے کہ میں کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں مجھے اس بات سے چنداں سروکار نہیں ہے کہ تبصرہ نگار کسی فن کا مظاہرہ کر رہا ہے یا کسی مشق یعنی Skill کا؟ مجھے اس سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے کہ جو تبصرہ میں پڑھ رہا ہوں اس میں اور کسی تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہونا چاہیئے۔ مکتبی سوالات تو محض طالب علموں کی دلچسپی کے ہیں، علمی سوالات کی اہمیت صرف تبصرہ نگار کے لئے ہے لیکن اخلاقی سوال میں تینوں شرکاء (قاری، کتاب اور مبصر) پوری طرح الجھے ہوئے ہیں اس لئے اس سوال کو حل کر لیا جائے تو تبصرہ نگاری کے بارے میں بہت سی بنیادی باتیں صاف ہو جائیں گی۔

کچھ دن ہوئے ایک معروف شاعر نے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا کہ تبصرے کی نوعیت محض ایک اشتہار کی ہوتی ہے اس افسوس ناک نظریے پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ ادبی برادری کا ایک بڑا اور سنجیدہ طبقہ تبصرے کے اخلاقی مسائل سے اس درجہ بے خبر ہے کہ وہ اسے محض ایک جانب دارانہ تقریظ سمجھتا ہے۔ بلکہ تقریظ تو پھر بھی کتاب کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کر کے ہی لکھی جاتی تھی۔ لیکن اشتہار کی عبارت بنانے والے کو تو اکثر یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کس چیز کی تعریف کر رہا ہے۔ عبارت بنانے والے سے کہہ دیا جاتا ہے کہ بھائی ایک نیا صابن بازار میں آنے والا ہے۔ اس کے لئے عبارت بنا دو، وہ اپنی جودت طبع کو کام میں لا کر کوئی دلچسپ یا توجہ انگیز عبارت گھڑ دیتا ہے۔ اگر

تبصرے اتنے ہی پست درجے کی چیز ہے تو پھر ادیب اور قاری (ادیب خاص طور پر، قاری عموماً) اپنی پسند کا تبصرہ نہ پا کر اتنے برہم کیوں ہوتے ہیں۔؟

ہماری جدید ادبی صورت حال کا ایک عبرتناک پہلو یہ ہے کہ ایک طرف تو اپنے اور پرائے سے اچھا تبصرہ دیکھنے کے مشتاق رہتے ہیں اور اس کے لئے سعی بھی کرتے ہیں، اور دوسری طرف تبصرے کو اشتہار بازی کی سی گھٹیا چیز بھی کہنے پر مصر رہتے ہیں۔ یہ رویہ خود اعتمادی اور فنی ایمان داری کے فقدان کی دلیل ہے۔ اردو میں آزاد اور بے خوف تبصرہ نگاری کی روایت کے عدم استحکام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اکثر تبصروں سے اشتہار کا سا کام لیا ہے یا لینا چاہا ہے۔ چنانچہ اب بھی اگر کسی کتاب پر تعریفی یا تنقیصی تبصرہ ذرا بھی معمول سے ہٹا ہوا نظر آئے تو فوراً یہ افواہ اڑ جاتی ہے کہ مبصر یا رسالے کا مدیر مصنف کا دشمن یا دوست ہے۔ دراصل ہمارے یہاں تقریظ، دیباچہ اور تبصرہ ایک ہی قبیل کی چیز سمجھ لئے گئے ہیں، بس اس فرق کے ساتھ کہ تقریظ میں تعریف زیادہ مبالغہ آمیز ہونا چاہئے۔ دیباچے میں تعریف تو ہو لیکن مبالغہ کی آرائش ذرا کم ہو، تبصرے میں تو دیباچہ نما ہو لیکن ساتھ ہی کتاب کی قیمت، پبلشر کا نام، اور دیگر تفصیلات بھی درج ہوں۔ اگر تبصرہ نگار یا مدیر مصنف سے ناراض ہے تو مستقل عنوانات (قیمت، پبلیشر کا نام) تو ویسے ہی رہیں۔ بس مبالغہ آمیز تعریف، مضحکہ آمیز تنقیص میں بدل جائے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ تبصرہ اگر تعریف پر مبنی نہ لکھا جاتا ہو تو تقریظ کی روایت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ غالب نے جب آئین اکبری پر تقریظ لکھی تو سرسید کی مبالغہ آمیز عیب جوئی نہیں کی تھی بلکہ عیب جوئی سرے سے کی ہی نہیں تھی اور صرف یہ لکھا تھا کہ زمانہ بدل رہا ہے، لیکن تم ابھی تک پرانی باتیں لئے پھر رہے ہو۔ انگریزوں کو دیکھو، وہ کس طرح پانی پر دھوئیں کے جہاز چلاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ گویا غالب نے اصولی اختلاف کیا تھا، جوتیاں لے کر پل نہیں پڑے تھے۔ لیکن میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کے مصداق جب ہمارے اردو ادب کے شیروں نے تقریظ کی روایت کو پرانے ادب کے جنگل سے اکھاڑ کر نئے ادب کی کھیتی میں تبصرے کے نام سے آباد کیا تو آسانی سے یہ بات نظر انداز کر دی کہ تقریظ میں اگر عیب چینی بھی ہو تو اصولی اور علمی ہوتی ہے۔ چنانچہ تعریف کے تیور تو وہی رہے صرف ظاہری رکھ رکھاؤ بدل گیا۔ لیکن اظہار ناراضی کے لئے اصولی اور علمی متانت کو بالائے طاق رکھ کر کڑوے تیور اختیار کئے گئے کہ کتاب کا پتہ پانی ہونے لگا۔ لہٰذا جہاں اس طرح کے جملے ہمارے تبصروں میں بہت عام ہیں کہ کتاب اردو ادب میں اضافہ ہے، لازوال ہے، غیر معمولی کارنامہ ہے، شاعر/افسانہ نگار/تنقید نگار نے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ فنی نزاکتیں اور فکری باریکیاں موصوف پر ختم ہیں وغیرہ۔ وہاں ایسے بھی خشم ناک اور سنگین فیصلے بھی دکھائی دیتے ہیں: مصنف جاہل ہے، شاعری/تنقید/افسانہ نگاری کے فن سے

قطعاً بے گانہ ہے، تعجب ہے کہ موصوف اس قدر کم علم ہیں کہ۔۔وغیرہ

یہاں پر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اگر ہمارے تبصروں کی بیشتر تعداد ایسی ہی سطحی، کم کوش، تقریباً جھوٹی (اور جھوٹی نہیں تو حد سے زیادہ تعمیم زدہ) تحریروں پر مشتمل ہو تو قاری ایسی چیزوں کو برداشت کیوں اور کیسے کرتے ہیں؟ احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت کم زور، نیم جان سا احتجاج کبھی کبھی ضرور ہوتا ہے، لیکن عموماً قاری یا تو بے خبری کی وجہ سے تبصرے کو صحیح سمجھتا ہے اور اس سے اتفاق کرتا ہے، یا پھر جان بوجھ کر ایسی تحریر کو قبول کرتا ہے، کیوں کہ وہ بھی مصنف کے لئے اسی قسم کا معاندانہ رویہ رکھتا ہے جیسا کہ مبصر یا مدیر کا تھا۔ لاعلم قاری بے چارہ تو دونوں طرف سے مارا جاتا ہے کیوں کہ اگر وہ مصنف اور مدیر/مبصر کے تعلقات سے بے خبر ہے تو تبصرے کو بالکل صحیح سمجھ کر قبول کرتا ہے، اور اگر وہ مصنف سے بالکل بے خبر ہے، یا اس کے بارے میں محض ایک دھندلا سا تصور رکھتا ہے تو اس کی تمام تر رائے اس تبصرے کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے جو اس نے پڑھا ہے۔ لیکن بڑا قصور تو باعلم قاری کا ہے، جو اپنی رایوں، اپنے تعصبات، اپنے جہل کا انعکاس تبصرے میں دیکھنا پسند کرتا ہے اور اس طرح انتہا پسندانہ تبصرہ نگاری کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ جس طرح جمہوریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں ہمیں ویسی ہی حکومت ملتی ہے جس کے ہم مستحق ہوتے ہیں۔ اسی طرح تبصروں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قاری کو تبصرے بھی ویسے ہی ملتے ہیں جن کا کہ وہ مستحق ہوتا ہے۔ آج کا قاری پچاس برس کے لوگوں کی طرح ادبی مسائل اور صورت حال سے کلیتہً بے خبر نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے تعصبات ہوتے ہیں۔ بیش تر معروف لکھنے والوں کے بارے میں اس کی ذاتی رائے بھی ہے جو ہمیشہ ادبی بنیادوں پر نہیں قائم کی جاتی۔ چنانچہ اگر مجھے شاعر الف سے کسی وجہ سے کد ہے تو میں اس کی کتاب پر سخت تبصرہ پڑھنا پسند کروں گا۔ اور ایسا تبصرہ پڑھ کر خوش ہوں گا، یہ نہ سوچوں گا کہ مبصر نے کتاب کو غور سے پڑھا بھی ہے کہ نہیں۔ چنانچہ اگر مبصر نے لکھ دیا کہ شاعر زیر بحث کا اسلوب دوسرے شعرا سے مستعار ہے تو میں اس رائے کو فوراً قبول کر لوں گا اور اس بات پر اعتراض نہ کروں گا کہ مبصر نے مثالیں نہیں دی ہیں۔ لیکن اگر مجھے شاعر سے کسی وجہ سے ہم دردی ہے تو میں فوراً اعتراض کروں گا کہ دوسرے شعرا سے کھلے استفادے کی مثالیں کیوں نہیں دی گئیں۔

لیکن تبصرے میں جانب داری کا مسئلہ اتنا آسان اور سادہ نہیں ہے جتنا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ اوپر کی بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تبصرے میں غیر جانب داری بہت بڑی چیز ہے، اور تبصرہ دیباچے یا تقریظ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ لیکن یہ نتیجہ پوری طرح درست نہ ہوگا۔ کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ تبصرے میں مکمل جانب داری نہ ممکن ہے نہ مستحسن۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ کسی رسالے میں جو مضامین چھپتے ہیں وہ لازماً

ادارے کی پالیسی کے آئینہ دار نہیں ہوتے، لیکن جو تبصرے چھپتے ہیں وہ یقیناً اس کی پالیسی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یعنی یہ تو ممکن ہے کہ کسی ترقی پسند پرچے میں جدیدیت پر مضمون چھپ جائے، جو یک گونہ تعریفی ہو، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس میں کسی جدید شاعر کے کلام پر تبصرہ بھی چھپ جائے تو صیفی اور تحسین آمیز ہو۔ مضمون نگار کو تو آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرے، چاہے وہ خیالات ادارے کے نظریات سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہوں۔ لیکن تبصرہ نگار ادارے کے ذہن کا نمائندہ ہوتا ہے، تبصرہ ہی پڑھ کر یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس پرچے کے ارباب حل وعقد کس قسم کا ادب پسند کرتے ہیں۔ کسی پرچے میں الف کی نظم یا افسانہ نگار ب کا افسانہ چھپ جانا لازماً یہ معنی نہیں رکھتا کہ یہ رسالہ شاعر الف یا افسانہ نگار ب کے ادبی نظریات و اسالیب اظہار کو نظر استحسان سے دیکھتا ہے۔ لیکن اگر اس میں شاعر الف یا افسانہ نگار ب پر تحسینی تبصرہ چھپے تو یقیناً ایسا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا تبصرہ نگاری میں کلی طور پر جانب داری کا دعویٰ صرف وہی کرسکتا ہے جو یا تو دیوتا ہو یا بہت بڑا احمق۔ اگر کوئی مبصر ہر طرح کی کتاب پر ایک ہی طرح کا تبصرہ کرتا ہے تو یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ یا تو اس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے یا پھر اس نے وہ کتابیں پڑھی نہیں ہیں بلکہ محض فارمولے کا استعمال کر کے تبصرہ نگاری کی داد دے رہا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہر رسالے کا اپنا مزاج ہوتا ہے (یا ہونا چاہیے) اور کتابوں پر تبصرے رسالے کے مزاج اور کردار کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'معارف' میں افتخار جالب کے مجموعۂ کلام پر تحسینی تبصرہ نہیں ہوسکتا، اور نہ ہونا چاہیے۔ برہان میں عشقیہ گیتوں کے مجموعے پر تبصرہ اگر ہوگا تو محض مختصراً تذکرہ ہوگا یا نکتہ چینی سے مملو ہوگا۔ شاعر میں کسی ایسی کتاب پر توصیفی تبصرہ نہیں ہوسکتا جو اردو زبان یا سیماب اکبرآبادی کی مخالفت کرتی ہو، وغیرہ۔ ان تبصروں میں اس بات کا لحاظ نہ رکھا جائے گا۔ (اور نہ رکھا جانا چاہیے) کہ یہ کتابیں اصلاً کتنی اچھی، کتنی مدلل، خوب صورت یا پرزور ہیں۔ لہٰذا اس حد تک تو تبصرہ جانب داری کا اعلان ہوتا ہی ہے۔

دوسری طرف ہر مبصر کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ فرض کیجیے اردو مخالف کتاب جو شاعر میں تبصرے کے لئے آئی ہے اسے ایک ایسے شخص کے پاس بھیجا گیا جو اردو مخالفوں کے بارے میں جذباتی رویہ نہیں رکھتا، بلکہ عقلی اور استدلالی سطح پر ان سے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ ایسے شخص کا تبصرہ اس شخص کے تبصرے سے مختلف ہوگا جو اردو کے مخالفوں کے بارے میں جذباتی رویہ رکھتا ہے۔ اول الذکر مبصر کتاب کی علمی اور استدلالی خامیوں کا تذکرہ کرے گا۔ موخر الذکر، ممکن ہے، مصنف کتاب کو ملک دشمن، فاشسٹ، مجرم اور بے ایمان کہہ دے۔ دونوں تبصروں میں اصول تو ایک ہے لیکن رویہ اور نقطۂ نظر کے اختلاف نے تبصروں میں زمین آسمان کا

فرق کر دیا۔ ممکن ہے اردو مخالف مصنف نے اپنی رائے کا اظہار علمی اور سائنسی ایمانداری کے ساتھ کیا ہو اور اس میں تنگ نظری، بے ایمانی اور شر انگیزی کا شائبہ تک نہ ہو۔ لیکن جذباتی نقطہ نظر والے مبصر نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ عقلی نقطہ نظر والے مبصر سے مختلف تھا۔

یہ صورت حال تخلیقی ادب کی کتابوں پر تبصروں میں اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ افتخار جالب کی ہی مثال پھر لیجئے۔ افتخار جالب ایک جدید لیکن انتہا پسند شاعر اور نقاد ہیں۔ بہت سے پرچے ایسے ہیں جو جدیدیت کے مخالف نہیں ہیں لیکن انتہا پسندی کے اس اظہار سے خوف کھاتے ہیں جو افتخار جالب کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں افتخار جالب پر تبصرہ کسی اور نہج سے ہوگا۔ وہ ان کے نکالے ہوئے نتائج سے اتفاق تو کریں گے لیکن احتیاط کے ساتھ۔ وہ انہیں جدید تو مانیں گے لیکن گم راہ، یا کم سے کم گمراہی کی طرف مائل۔ قدامت پسند رسالے میں مبصر افتخار جالب کو مہمل گو بتائے گا، لیکن وہ افتخار جالب کے حوالے سے ساری جدید شاعری کو مطعون و مسترد کرے گا۔ ترقی پسند رسالہ افتخار جالب کے وجود سے ہی شاید انکار کر دے۔ لیکن کسی بھی مبصر پر آپ بے جا جانبداری یا تعصب کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ان میں ہر ایک نے اپنی اپنی روشنی میں کتاب کو پرکھا ہے اور اپنے اپنے نظریات کے حوالے سے صحیح رائے دی ہے۔ جو لوگ ان مبصروں کو ایمان داری سے عاری کہیں گے وہ خود ایمانداری سے عاری ٹھہریں گے کیوں کہ وہ اپنی ایمانداری دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں، یہ رویہ بے ایمانی کی پہلی منزل ہے۔

تو پھر تبصرے میں غیر جانبداری اور تعصب کیا شے ہے؟ جب ہر سنجیدہ رسالے کی ایک پالیسی ہوتی ہے اور ہر سنجیدہ مبصر کا ایک نقطہ نظر اور دونوں کے رنگوں کا انعکاس تبصرے میں لازم، مستحسن اور متوقع ہے۔ تو پھر غیر جانبداری سے کیا مراد ہے؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے پہلے قضیے کی طرف واپس جانا ہوگا۔ جہاں میں نے اس ذہنیت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ بعض سنجیدہ لوگ بھی تبصرے کو اشتہار سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ یعنی غیر جانبداری تو مبصر کے لئے سم قاتل اور تبصرے کے لئے موت ہے۔ کیوں کہ پھر تو تبصرہ یا تو بالکل بے رنگ ہوگا یا بالکل یک طرفہ بیان سے زیادہ نہ ہوگا۔ لیکن انفرادی غیر جانبداری مبصر کے لئے یقیناً از حد ضروری اور اس کے فن کا پہلا تقاضا ہے۔ انفرادی غیر جانبداری سے میری مراد یہ کہ تبصرہ لکھتے یا لکھواتے وقت مبصر اور مدیر اس کو نظر انداز کر دیں کہ مصنف سے ان کے تعلقات کیسے ہیں؟ مصنف کی ادبی شہرت اور حیثیت کیا ہے؟ ورنہ وہ غیر جانبداری تو کچھ نہ ہوئی جو چھوٹے موٹے ادیبوں یا اجنبی مصنفوں کی کتابوں کے ساتھ تو پورا پورا تجزیہ و تحسین و تنقیص روا رکھتی ہے لیکن بڑے ادیب کی کتاب یا اپنے کسی دوست شناسا کی تحریر دیکھ کر اس کے منہ

میں آبلے پڑ جاتے ہیں اور وہ بولنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔ تبصرہ نگاری آبگینوں کو ٹھیس سے محفوظ رکھنے کا نام نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ایسی باتیں نہ لکھئے جن سے مصنف یا پبلیشر کو تکلیف پہنچے۔ مصنف اور پبلیشر سے میری درخواست یہ ہے کہ جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل سے ڈرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر آپ کی کتاب میں مبصر کو عیوب یا نقائص یا خامیاں نظر آئیں تو وہ لامحالہ ان کا تذکرہ کرے گا، اس پر برا ماننے کی کیا بات ہے؟ لیکن آج کل مصنف اور پبلیشر بھی اسکول کے بچوں کی طرح ہو گئے ہیں جو نتیجہ خراب ہونے پر ممتحن اور اسکول کے دوسرے ارباب حل وعقد کو گالیاں بناتے ہیں بلکہ مار بیٹھنے سے گریز نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ غیر ادبی، غیر فن کارانہ اور عمومی ایمانداری کے خلاف ہے۔ اس خصوصی اور مشکل ایمانداری کا تو ذکر ہی کیا جسے ہم فن کارانہ ایمانداری کہتے ہیں۔

لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ کسی ادیب پر تبصرہ صرف اس وجہ سے سخت لکھنا کہ ہمارے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، یا اس نے ہماری کتاب پر سخت تبصرہ لکھا تھا، یہ بھی مبصر کی انفرادی ایمانداری کے منافی ہے۔ اور یہ رویہ بھی اتنا ہی غیر ادبی ہے جتنا وہ رویہ جو خیال خاطر احباب پر آزادی رائے کو قربان کر دیتا ہے۔ مبصر اگر تبصرہ موافقانہ لکھتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ مصنف کا دوست ہے، اور اگر مخالفانہ لکھتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ مصنف اس کا دشمن ہے۔ یہ تصویر اگر ہمارے درمیان میں عام ہو جائے تو غیر ذمہ دارانہ تبصرے جن میں فن کارانہ ایمانداری کا فقدان ہے۔ خود بہ خود کم ہو جائیں گے۔ اس وقت تو قاری کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تبصرہ اگر اچھا ہے تو دوست نے لکھا ہے اور اگر خراب ہے تو دشمن نے۔ جب مبصر کو یہ بات معلوم ہے تو پھر وہ بھی اس رسم کی پابندی کرتا ہے۔ مجھ سے اکثر یہ پوچھا گیا ہے کہ آپ نے فلاں بڑے ادیب پر سخت تبصرہ کیا تھا، کیا آپ میں اور ان میں کوئی اختلاف رائے ہے؟ اس کا الٹا بھی ہوا ہے کہ کسی کتاب کی تعریف میں نے کی ہے تو لوگوں نے فرض کر لیا ہے کہ مصنف خود ان حضرت کا دوست ہوگا۔ کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد یہ فضا ایک حد تک بدلی ہے لیکن وہ بھی صرف چند مبصروں کے حق میں۔ عام طور پر مصنف خود تبصرہ لکھ کر کسی دوسرے کا نام سے چھپوا دیتا ہے، لہٰذا تبصرہ نگاری میں جانبداری کی مسموم جڑ پوری طرح اکھڑی نہیں ہے۔ اس کو اکھاڑنے میں قاری اور پھر مصنف سب سے زیادہ کام کر سکتے ہیں، کیونکہ جس دن محسوس ہونے لگا کہ نہ قاری اور نہ مصنف جھوٹے تبصروں کو قبول کرنے پر راضی ہے، اسی دن سے ان مبصروں کی ضرورت ختم ہو جائے گی جو مصنف یا مدیر یا پبلیشر کی رضا کو مقدم جانتے ہوئے قاری کو جہل اور اندھی تعریف کا گاڑھا میٹھا محلول تبصرے کے گلاس میں پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

میں نے تبصرہ نگاری کے اخلاقی پہلو کو اس وقت خاصی اہمیت دی ہے کیونکہ حالات حاضرہ کا تقاضا

یہی ہے، ورنہ بہتر فضا اور صورت حال میں سب سے اہم سوال یہ ہوتا کہ تبصرے اور تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہے؟

اس سوال کا جواب طوالت اور اختصار، محدود یا غیر محدود دائرہ کار، وغیرہ کے حوالے سے نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ تبصرہ بیس صفحے کا ہو کر بھی تبصرہ ہی رہے اور تنقیدی مضمون دو ہی صفحے کا ہو لیکن تنقید کہلائے۔ (یہاں میں میکالے اور اس کی قبیل کے دوسرے تبصرہ نگاروں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو کتاب کا نام، مصنف کا نام اور دیگر تفصیلات اوپر لکھ کر اپنے طور سے ایک پورا مضمون لکھ ڈالتے تھے) دراصل تبصرے اور تنقیدی مضمون کی روح میں فرق ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ تبصرے کی ایک مخصوص ہیئت ہوتی ہے، یعنی یہ کہ تبصرہ جس کتاب پر کیا جاتا ہے اس کا نام، مصنف کا نام، پبلیشر، سائز، قیمت، صفحات، گیٹ اپ وغیرہ تمام تفصیلات اس میں درج ہوتی ہیں، بنیادی بات یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا رویہ نقاد کے رویے سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلا فرق تو یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا مخاطب بہت فوری اور سامنے کا قاری ہوتا ہے۔ تبصرہ اس لئے نہیں لکھا جاتا کہ اسے دس سال کا قاری پڑھے گا، تبصرہ اس لئے لکھا جاتا ہے کہ جو قاری اس وقت موجود ہے اسے کتاب سے متعارف کیا جائے۔ تنقیدی مضمون کا مخاطب آج کا بھی قاری ہوتا ہے اور کل کا بھی۔ لہٰذا اس میں ایسے فیصلے اور رائیں دینے سے احتراز کیا جاتا ہے جن کی درستگی Valilidity آئندہ زمانے میں مشکوک ہو سکے یا ہو جائے۔ مثلاً ضرب کلیم پر تنقید لکھنے والا یہ تو کہہ سکتا ہے کہ یہ کتاب ناکام ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کی شاعری ناکام ہو گئی ہے یا ختم ہو چکی ہے۔ اس کے برخلاف مبصر ضرب کلیم کو ناکام کتاب کہہ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اقبال کی شاعری میں دم نہیں رہا۔ تبصرہ ایک لمحاتی اور فوری چیز ہوتی ہے۔ تنقید اور ایک مستقل اور پائیدار تحریر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تبصرہ دس سال بعد نہیں پڑھا جا سکتا۔ یقیناً پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے فوراً پڑھا جائے۔ اس کے پڑھنے والے وہ لوگ ہوں جو مصنف کے عہد میں رہتے ہیں، جو مصنف کو عصری ماحول کے تناظر میں دیکھ سکتے ہوں۔ اچھے تبصرے بہت دیر تک زندہ رہتے ہیں، اور رہے ہیں، لیکن یہ اتفاقی امر ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ تبصرہ نگار اپنے موضوع کے ساتھ ایک انتہائی ذاتی اور تاثراتی رشتہ رکھتا ہے۔ کتاب پڑھتے وقت اسے اس بات سے زیادہ دل چسپی نہیں ہوتی کہ مصنف کے ذاتی حالات کیا ہیں، وہ کیا محرکات ہیں جنہوں نے اس کتاب کو جنم دیا ہے۔ اس کا تعلق کتاب کے Gestatt سے زیادہ ہوتا ہے، پس منظری تفصیلات سے کم۔ مثلاً کسی نظم کو پڑھ کر وہ اس کے ذریعے پیدا ہونے والے فوری تاثر کو تبصرہ میں بیان کرتا ہے، لیکن نقاد صرف اسی پر بس نہیں کرتا۔ وہ نظم یا مجموعۂ کلام کو پڑھ کر اس کا رشتہ مصنف کی دوسری (بقیہ صفحہ نمبر 30 پر)

ابھی جوار شاد ہو رہا تھا کہ ہم سے کیوں کوئی بولتا ہے　یہ گدگدانا یہ بوسۂ لب اسی کا ردِّ عمل سمجھیے

اپنی شاعری کی جنسیت اور ارضیت کے باوجود وہ عشق اور ہوسنا کی کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ عملاً ہجر نصیب شاعر ہونے کے باوجود حرماں نصیبی کی فضا، چند اشعار کے استثناء کے ساتھ، شادؔ کی عشقیہ غزلوں میں نہیں پائی جاتی۔ انھیں خود بھی اعتراف ہے کہ ''میرے یہاں غمِ جاناں کا ذکر بہت کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں محبت میں خودداری کو ہاتھ سے دینے کا قائل نہیں ہوں۔'' ان کی پوری عشقیہ شاعری دیکھ جایئے۔ بہت کم اشعار اس روایتی انداز میں ملیں گے جس میں ہمارے غزل گو محبوب کو ستم پیشہ اور غارت گر قرار دے کر اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ملتے ہیں، اور دشنام یار کے طبع حزیں پر گراں نہ گزرنے کا اعلان فرماتے ہیں۔ غالب کی طرح شادؔ بھی اس معاملے میں بے حد غیور اور خوددار عاشق ہیں۔ محبوبہ کو جی جان سے چاہتے ہیں لیکن اس کے ہاتھ اپنی عزت نیلام نہیں کرتے:

محبت میں خودی کی موت بھی دیکھی نہ جائے گی　اگر میں بارِ خاطر ہوں تو اٹھ جاؤں ترے در سے

جھٹک کے ہاتھ سے دامن کو جانے والے، بس　ترے خیال کا دامن بھی چھوڑتا ہوں میں

کس طرف رُوئے سخن ہے، نام اس کا لیجیے　بن بُلائے آپ کی محفل میں آتا کون ہے

یہ تو مت محسوس ہونے دیجیے　اجنبی ہیں آپ کی محفل میں ہم

ان کی شاعری میں بڑی باوقار اور توانا ارضیت ہے۔ عام بول چال کی زبان میں اس نُدرتِ ادا کے ساتھ جو صرف انھیں سے مخصوص ہے، حقیقت پر مبنی واقعاتِ عشق کو بعینہٖ غزلوں میں منعکس کر کے شادؔ عارفی نے عشقیہ شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اُن کی عشقیہ غزلیں غیر ضروری آرائش کے عناصر سے بالکل پاک ہیں۔ اسی لیے تغزل پسند طبیعتیں غزل کے مروجہ معیاروں کی روشنی میں ان کی غزلوں کی سچی قدر نہیں کر پاتیں۔□□□

بقیہ: تبصـــرہ نگاری کا فن

کتابوں اس کے ہم عصروں، اس کے ماضی و حال سے بھی قائم کرسکتا ہے۔ تنقید محرکات وعوامل، اصل الاصول اور تخلیق کی گہرائیوں سے بھی بحث کرسکتی اور کرتی ہے، تبصرہ خود صرف تخلیق زیرِ بحث کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے ذاتی ردِّعمل تک محدود رکھتا ہے۔ تنقید نگار کی بہت سی شخصیات بہ یک وقت کارفرما ہوسکتی ہیں، مورخ، نفسیات داں، عروضی، فلسفیانہ تجزیہ کار وغیرہ۔ یا اگر یہ سب نہ بھی ہو تو اس کا کم سے کم ایک مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے جسے ایک فکری نظام واستدلال کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف تبصر استدلال اور Argument کے ذریعہ کوئی نظریہ نہیں کرتا بلکہ کسی بنائے نظریہ یا نقطۂ نظر کی روشنی میں کسی مخصوص کتاب کا جائزہ لیتا ہے۔□□□

حیات جہدِ مسلسل کا نام ہے فرحت — جمود سے بھی مقدر کہیں بدلتا ہے

بیادِ خلیل فرحت کارنجوی (مرحوم)

سہ ماہی

اردو

امراؤتی

۳ — شمارہ نمبر ۳ — امراؤتی، مہاراشٹر (ہند) — جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء

سرپرست

جناب منور پیر بھائی (پونہ) — محترمہ حمیدہ معین رضوی (سرے، یو۔کے) — جناب عبدالکریم سالار (جلگاؤں)

مدیر

وسیم فرحت کارنجوی (علیگ)

Email:wkfarhat@gmail.com Cell.09370222321

نائب مدیر: ڈاکٹر کلیم ضیاء — معاون مدیر: تحسین اسرار

مجلس مشاورت

سید صفدر، شمیم فرحت، ڈاکٹر آغاز، ساجد محشر

فی شمارہ	۵۰ روپے
سالانہ	۱۵۰ روپے
سرکاری اور اداروں سے	۲۵۰ روپے
تاحیات ممبر شپ	۳۰۰۰ روپے
یورپی ممالک کیلئے	۱۲۲ امریکی ڈالر
برطانوی ممالک کیلئے	۱۶ پاؤنڈ
پاکستان کیلئے	۹۰۰ ہندوستانی روپے
خلیجی ممالک کیلئے	۹۰۰ ہندوستانی روپے

خط و کتابت کے لیے:

Waseem Farhat Karanjvi (Alig)
Post Box No.55, H. O,
AMRAVATI-444601(M.S)INDIA

صرف زرِ سالانہ اور رجسٹری ڈاک کے لیے:

The Editor,URDU,
"Adabistan", Near Wahed Khan
UrduD.Ed.College, Walgaon Road,
AMRAVATI-444601,Maharashtra (India)

پاکستانی خریداروں کا صرف زرِ سالانہ بھجوانے کیلئے:

بزم تخلیق ادب پاکستان
II-B/18، کمرشل ایریا، نزد سپر ایشیا بیکری، ناظم آباد، کراچی
موبائل: 0321-8291908

اگر آپ چیک یا ڈرافٹ بھیجنا چاہیں تو صرف WASEEM FARHAT اس نام سے بھیجیں۔
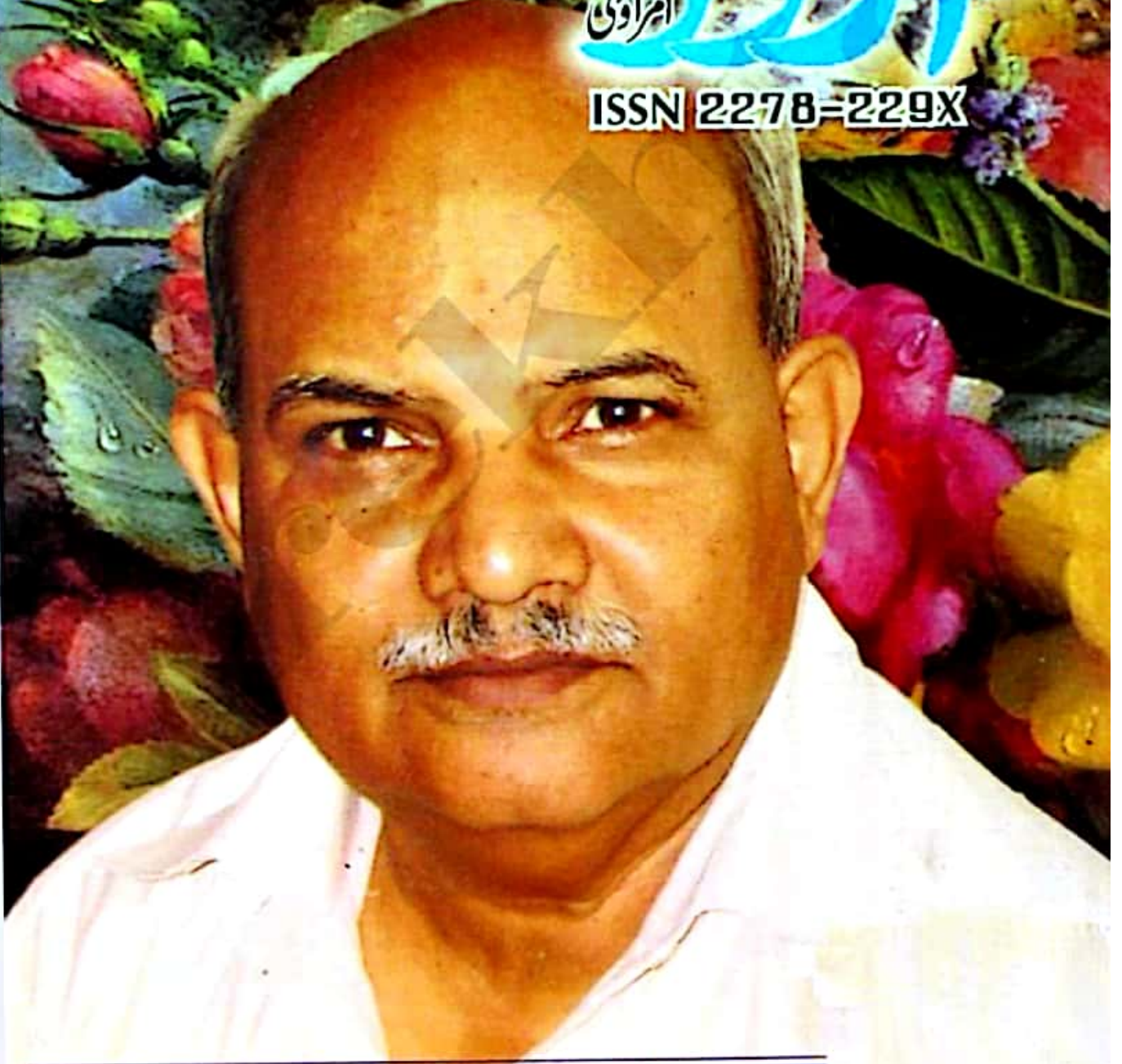
سہ ماہی
اردو
امراوتی
ISSN 2278-229X
مدیر
وسیم فرحت کارنجوی
(علیگ)
بابِ نثر
شمس الرحمن فاروقی، حمیدہ معین رضوی، مظفر حنفی، شان الحق حقی، حیدر علوی
خواجہ اکرام، مناظر عاشق ہرگانوی، حبیب ریتھ پوری، کلیم ضیا، فراز حامدی
بابِ نظم
ادا جعفری، منور رانا، ڈاکٹر اعظم امروہوی، شمیم فرحت، سلیم انصاری، ابرار نعمی، صدف اقبال
بابِ افسانہ
وکیل نجیب، اقبال حسن آزاد، سراج فاروقی، صابر فخر الدین
جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴